رفعت مرتضٰی
فلوریڈا ۔

نصرت کی یادداشتیں
(ناول آدم کی پسلی سے)

آج کل اسے ایک بہت پرانی بات اکثر یاد آجاتی تھی۔ بغیر کسی وجہ کے، یونہی چلتے پھرتے، کسی کام میں مصروف، کوئی بھی کام جس کا تعلق اس پرانی یاد سے بظاہر کچھ بھی نہ ہوتا ۔
وہ اپنی دوست سے مل کر آرہی تھی ۔
مگر یہ واقعہ یوں شروع نہیں ہوتا اور شائد اتنا سیدھا سادا ہے بھی نہیں گو ، اس وقت وہ پورا واقعہ شائد اتنا ہی تھا کہ وہ اپنی دوست سے مل کر آرہی تھی۔ سردیوں کے دن تھے ، شائد دسمبر کا مہینہ ہوگا ۔ بہت دن سے اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ اپنی دوست سے ملنے اس کے گھر جائے گی ، اس کی سہیلی اسے روز اپنے گھر بلاتی ہے اس لئے وہ ضرور ، ضرور اس کے گھر جائے گی ۔ اس سے پہلے کی اور کوئی یاد اس کے اس کے ذہن میں محفوظ نہیں تھی جب اس کی کوئی اور دوست ، کوئی سکھی سہیلی رہی ہو جس نے اسے بلایا ہو ، یا اس کے ساتھ بیٹھی ہو ، ہنسی بولی ہو۔ اماں جو کبھی بھی کسی بھی بات کے لئے پہلی ہی بار رضامند ہو جانے پر یقین نہیں رکھتی تھیں اسے بَرا بَر ٹال رہی تھیں۔ کبھی ڈانٹ بھی دیتیں مگر وہ چند دِن چُپ رہ کر پھر موقعہ ملتے ہی اپنی سہیلی کا تذکرہ شروع کر دیتی۔ پھر ایک روز جب ابا اپنے طویل دورے سے واپس لوٹے اورجب اُن کے بند بستر کو کھول کر چھت پر دھوپ میں پھیلا دیا گیا ، میلے کپڑے دھوبی کے پاس چلے گئے ، بچوں کو اُن کے مراتب کے حساب سے کھلونا بھی دے دیا گیا اور بڑے کمرے میں آتشدان کے سامنے بچھے دیوان پر ابا کاہی رنگ کے مخمل کے لحاف میں لپٹ کر لیٹ گئے تو اس نے اُن کے سامنے یوں کھڑے ہو کر کہ پشت پر ابا ہوں اماں سے کہا اماں میں اپنی سہیلی کے گھر جاؤں گی ۔ آپ نے کہا تھا ابا کے آنے کے بعد آپ جانے دیں گی ۔ اب تو ابا آ گئے ہیں نا۔ میں جاؤں ؟ اور اماں کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی ابا نے کہا ہاں ہاں جاؤ ، عبدالرحیم سے کہو لے جائے مگر ساتھ میں نجمہ کو بھی لے جاؤ بلکہ چھوٹو جمیل کو بھی۔ سیر ہو جائے گی اُس کی بھی۔
نصرت نے ابا کا حکم ناگواری سے سُنا اور غصے سے چھوٹے بھائی بہن کی طرف دیکھا پھر ابا کی طرف دیکھتے ہوئے چھوٹی سی آواز میں کہا مگر ابا میں ان کو کیوں لے کر جاؤں ؟ وہ تو میری سہیلی ہے اور ابا نے کہا بس پھر کوئی بھی نہیں جائے گا۔ یہ انصاف نہیں تھا مگر چارہ بھی نہیں تھا کوئی اور ۔ وہ چپ ہوگئی ۔ ابا نے عبدالرحیم کو دروازے پر بلایا اور کہا کہ نصرت بی بی اپنی سہیلی کے گھر جانا چاہتی ہے مگر وہاں سب بچے جائیں گے۔ پھر انہوں نے ایک کاغذ پر سہیلی کا نام ، سہیلی کے باپ کا نام اور محلے نام لکھ کر عبدالرحیم کو دیا " اگر گھر نہ ملے تو کسی سے پوچھ لینا۔ مگر خواہمخواہ ادھر اُدھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں ، اور اب لے جاؤ انہیں۔ " اور جب سب دروازے سے نکلنے ہی والے تھے کہ انہوں نے پھر عبدالرحیم سے کہا " دیکھو زیادہ دیر بیٹھنا نہیں وہاں اور واپسی میں کلب میں چھوٹے اور بڑے بابا سے جلدی گھر آنے کا کہتےہوئے آنا"
ایک بار پھر نکلنے کو ہوئے تو اب کے اماں نے روک لیا " اور دیکھو کچھ بھی کھانا پینا نہیں وہاں، ان لوگوں کے

کے گھروں میں ہمیں منع ہے کچھ بھی کھانا۔ پیٹ ناپاک ہو جائے گا ، کہہ رہی ہوں " نصرت اچھا ، اچھا ، اچھا کہتے کہتے جھنجھلا گئی ۔ عبدالرحیم دروازے پر سر جھکائے منتظر کھڑا تھا ، چھوٹو جمیل اور نجمہ اس کے پاس کھڑے تھے اور اماں چپ ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اچھا اماں ، اچھا اماں کہتے کہتے وہ دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ نکلتے نکلتے اس نے مڑ کر دیکھا تو ابا اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ بُہت عجیب سی بات تھی اُس کے لئے۔ اس نے ہمیشہ اماں ابا کو ایک فاصلے سے ایک دوسرے سے بات کرتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے دونوں کو اسطرح قریب آتے دیکھا۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور جا کر عبدالرحیم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر ایک ہاتھ سے اس نے چھوٹے جمیل کو اُٹھا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ کی اُنگلی نجمہ کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے نجمہ کے قریب ہو کر خود بھی عبدالرحیم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو نجمہ نے اُسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر پرے ہٹایا اورخود پھر سے عبدالرحیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کا جی چاہا وہ رو دے ؛ پہلے اماں ابَا اور اب نجمہ ! مگر وہ اپنی سہیلی کے پاس جا رہی تھی ۔ آنکھوں میں آئے آنسو کہیں اندر اُتر گئے۔

بہت زیادہ ڈھونڈنے کی نوبت نہیں آئی ، سہیلی کا گھر جلد ہی مل گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک عورت ہرے رنگ کا گھاگرا اور اودے رنگ کی لہریا چادر اوڑھے باہر نکلی۔ ابھی وہ کچھ بولی نہیں تھی کہ نصرت کی سہیلی بھی دروازے پر آ گئی ؛ نصرت کو دیکھل تو خوش ہو کر زور سے ہنس دی۔ " ماں دیکھ میری سہیلی آ گئی " اس نے ہنستے ہنستے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی ماں بھی ہنس دی اور پیار سے نصرت کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ " آجا دھی رانی " اور ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ سہیلی نے نصرت کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر لے گئی۔ " بابو میری سہیلی آئی ہے " اس نے زور سے کہا۔ اندر کمرے سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی تو نصرت نے سہم کر سہیلی کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا

" میرا بابو ہے" سکھی نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

چھوٹا سا گھر تھا، تنگ ڈیوڑھی سے آگے ایک کمرہ تھا جس میں دیوار سے لگے پلنگ پر لحاف اوڑھے ایک آدمی آدھا لیٹا آدھا بیٹھا تھا۔ سر پر گیروے رنگ کی پگڑی بندھی تھی۔ چہرے پر سیاہ داڑھی اور مونچھوں کا جنگل اُگا تھا اور بالوں کے اس جنگل میں بڑی بڑی بھورے رنگ کی آنکھیں اور لال ہونٹ جیسے مسکرا رہے تھے۔

" آؤ آؤ جی آیاں نوں، ست سری اکال ، اوئے ساڈی بنتو دی سہیلی آئی جے، جی آیاں نوں، لنگ آؤ جی لنگ آؤ "

لمبی گھنی داڑھی میں چھپے لال ہونٹ کھلتے بند ہوتے رہے، بھوری آنکھیں چمکتی مسکراتی رہیں اور بنتو کو بات کرنے کا کوئی بھی موقعہ دئے بغیر ، وہ خود ہی سب باتیں ، سوال بھی اور جواب بھی ، کرتا رہا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ، بچوں کو عزیز باتیں۔ پہیلیاں ، کہانیاں ، کہانیوں میں کہانیاں۔ نصرت کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی دوسری ہی دنیا میں ہو جہاں جگنو چمکتے ہوں اور پریاں اُڑتی پھرتی ہوں۔ پھر بنتو کی ماں نے بہت سا خشک میوہ ایک بہت بڑی پلیٹ میں ڈال کر ، بامنے لا کر رکھ دیا۔ نصرت نے ایک نظر پلیٹ پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔

" ہم کچھ نہیں کھائیں گے۔ اماں نے کہا تھا کوئی چیز کھانا نہیں ، پیٹ ناپاک ہو جائے گا" نصرت نے صاف صاف کہہ دیا۔

عبدالرحیم پریشان ہو کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گھبراہٹ میں اس کا رخ دروازے کی طرف ہو گیا۔

بنتو کے بابو نے قہقہہ لگایا ، یوں کہ اس کی ہنسی کی آواز چھت سے ٹکرا کر آئی اورکمرے کو ہلا دیا۔

" کج نا ہوندا کڑیئے ، کھا لے کھا لے۔ خشک میوہ کج نا کہندا۔ گیلی شے بھرشٹ ہوندی ، سُکی کج نا کہندی ، اپنی بےبے نوں سبک پڑھا جاکے ۔ کج وی نا پتہ اُس نوں ۔ بلکل کچی تیری ماں۔ لے کھا " بنتو کے بابو نے ہنستے ہنستے پلیٹ نصرت کے سامنے کر دی۔ " اوہو خان صاب بیٹھ جاؤ ، تُسی بھی بیٹھ جاؤ بادشاہو "

پھر اپنے کوٹ کی جیبوں میں چلغوزے ، سوکھی خوبانی ، بادام اورکشمش بھرے جب وہ گھر کی طرف جا رہے تھے تو عبدالرحیم نے اسے ڈپلومیسی کا پہلا سبق دینے کی کوشش کی۔ " نصرت بی بی ساری باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔ بیگم صاب کی باتیں سننے کےلئے تھیں کہنے کےلئے نہیں۔ مگر وہ تو سہیلی سے مل کر آنے کی خوشی سے سرشار تھی، کہاں تک اس بات کا اثر ہوا یا نہیں ہوا ، وہ بس اپنی اہمیت کے احساس سے لبالب بھری ، پھولی مرغی کی طرح ، ایک قدم سب سے آگے چلتی رہی۔ اس کی بنتو کے باپ نے اسے کتنا ہنسایا تھا، پیاری پیاری باتیں کی تھیں ، اس کو اپنے پاس بٹھایا تھا، سر پر ہاتھ رکھا تھا، بنتو کی ماں اس کے لئے میوے کا تھال لے کر آئی تھی، سب ایک ساتھ بیٹھے تھے اور خوش تھے۔ عبدالرحیم کا ڈپلومیسی پر سبق ابھی کچھ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

نصرت کی یاد میں آج بھی وہ احساس، اہمیت اور بڑےپن کا، اسی طرح جوں کا توں موجودتھا مگر بنتو کا نام، اس کی شکل اور اس کے شریر آنکھوں اور ہنستے ہونٹوں والے باپو کا نام اور شکل یاد کی گلیوں میں کہیں کھو چکے تھے۔

شام گہری ہو چکی تھی اور سب دکانیں بھی بند ہو چکی تھیں۔کہیں دور گھروں میں اکا دکا روشنی جھلملا رہی تھی اور جیسے ہی وہ بنتو کے گھر کی گلی پار کر کے چوک میں پہنچے دائیں ہاتھ پردکانوں کے سامنے پکی اینٹوں سے بنے چھوٹے میدان میں عوام الناس کے لئے بیت الخلا کے باہر سیڑھیوں پر وہ بیٹھا تھا اور اس کے سامنے آگ جل رہی تھی۔۔ ننگ دھڑنگ، میل سے اٹا ہوا سیاہ بدن ، کندھوں تک آتے ہوئے جھاڑ جھنکار بال بڑھی ہوئی گرد آلود داڑھی۔ وہ اسے کئی بار دن کی روشنی میں دیکھ چکی تھی۔ اب اس اترتی شام میں پہلی بار دیکھا تو اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور اور ایک طرف چھوٹی چھوٹی لکڑیوں اور کاغذوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس میں سے وہ تھوڑی تھوڑی دیر سے کچھ بھی اٹھا کر آگ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی نظریں آگ کے لپکتے شعلوں پر جمی تھیں اور چہرہ آگ کی روشنی میں اور بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر بابا عبدالرحیم سے لپٹ گئی ۔ عبدالرحیم نے دبی آواز مگر سخت لہجے میں کہا جلدی جلدی چلو ، رکنے کی، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دیر ہو رہی ہے ، صاب ناراض ہونگے۔۔ اور یہ کہتے کہتے اپنی رفتار بھی تیز کر دی ۔ وہ بھی ساتھ ساتھ، قریباً بھاگتے ہوئے چلنے لگی ۔ ڈر بے اس کی سانس تیز ہو گئی تھی اور گلے میں جیسے کچھ پھنسنے لگا۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے وہ مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتی، کہیں وہ پیچھے ہی تو نہیں چلا آرہا ۔اس کی سکھی جس سے مل کر وہ آ رہی تھی اس نے ایک روز آدھی جھٹی میں بتا یا تھاکہ وہ ننگا جنگلی آدمی افریقہ کا آدم خور ہے اور بچوں کو بھون بھون کر کھاتا ہے ۔ میرا باپو کہتا ہے اگر وہ نظر آئے تو اس کی طرف ہرگز ہرگز نہیں دیکھنا اس لئے کہ پھر وہ بچوں کو جادو سے اپنے پاس کھینچ لیتا ہے ۔ پہلے تو وہ انہیں جوئیں بنا کر اپنے بالوں میں جھوڑ دیتا ہے اور پھر جب بھوک لگتی ہے تو انہیں پھر سے بچہ بنا کر آگ پر بھون بھون کر کھانے لگتا ہے ۔ بنتو کی بات یاد آتے ہی اس کے پیر من من بھر وزنی ہو کر جیسے زمین سے ہی چپک گئےاور کبھی لگتا کوئی اس کے پیچھے، اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔ خوف سے اسے ہچکیاں آنے لگیں ۔ اسی وقت سامنے سڑک پر